غزالاں تم تو واقف ہو!

ادا جعفری

غزالاں تم تو واقف ہو

ادا جعفری

غالب پبلشرز، لاہور

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں

ناشر : اسداللہ غالب
غالب پبلشرز، پوسٹ بکس نمبر ۴۰۷۹، لاہور
دوسرا ایڈیشن : ستمبر ۱۹۸۲ء
مطبع : کمبائن پرنٹرز، لاہور
کتابت : عبدالحمید بھٹی
قیمت : ۳۶ روپے

عامر، عزمی،

صبیحہ اور زبیر

طلوعِ رنگ و دل آویزئ بہار کے نام
محبّتوں کے ہر اک خواب و اعتبار کے نام
نئ سحر کے سفیرانِ ذی وقار کے نام

سازوبرگ

○ انتساب ۵
○ مسجدِ اقصیٰ ۱۳

۱۹۶۸ء

○ رنگ کے روپ ہزار ۲۱
○ آگے حریمِ غم سے کوئی راستہ نہ تھا ۲۵
○ آج بھی ۲۷
○ اے مصحفِ سادہ ۲۹
○ مطلوب زندگی کو ابھی امتحاں نہیں ۳۲
○ پھول صحراؤں میں کھلتے ہوں گے ۳۴
○ مزاج و مرتبۂ چشمِ نم کو پہچانے ۳۶
○ آبلہ پا ۳۸
○ دل ضدی ہے ۳۹
○ وہ اعتمادِ خوئے ستم بھی بہانہ ساز ۴۱
○ کہتے ہیں کہ اب ہم سے خطاکار بہت ہیں ۴۳
○ کوئی آئینہ ۴۵
○ سوادِ شب ۴۹

○ جی نہ چاہا اسے بھلانے کو ۵۳
○ الفتح ۵۵

سفر نامہ

○ صنم کدوں کی سرزمیں ۶۱
○ رسمِ تعارف ۶۳
○ تضادِ رنگ ۶۶
○ زخمِ تماشا ۶۹
○ دید کا لمحہ ۷۲

۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء

○ ابھی تو شب خوں نہیں ہوا ہے ۷۷
○ گفتار میں بے ساختہ پن اب بھی وہی ہے ۸۱
○ یہ حکم ہے، تری راہوں میں دوسرا نہ ملے ۸۳
○ اوروں سے داستانِ بہار و صبا کہیں ۸۵
○ میری مجبور وفا ۸۷
○ لہو لہو راستے ۸۸
○ کس کس نے ساتھ چھوڑ دیا دھوپ چھاؤں میں ۹۱
○ گواہی ۹۳

○ نازِ وفا کا بت بھی ہمیں توڑنا پڑا ۹۵

سنہ ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۲ء

○ ناپشیماں ۹۹
○ حدودِ ذات کے صحرا میں کیوں گنواؤ مجھے ۱۰۵
○ نہ بام و دشت نہ دریا نہ کوہسار ملے ۱۰۷
○ شب چراغ آج کہاں سے لاؤں ۱۰۹
○ کیوں ۱۱۱
○ آرزو صبا جیسی پیرہن گلوں سا تھا ۱۱۴
○ کوئی پیماں نہیں ۱۱۶
○ تو جانتا ہے ۱۱۹
○ آج کی رات کتنی تنہا ہے ۱۲۱
○ دلوں کی راکھ غبارِ جبیں کی بات کرو ۱۲۳
○ کفارہ ۱۲۴

سنہ ۱۹۷۳ء

○ اے شہرِ عزیزاں ۱۲۷
○ وہی ناصبوریٔ آرزو وہی نقشِ پا وہی جادہ ہے ۱۳۱
○ دل پر جمالِ زخم کا احساں کوئی تو ہے ۱۳۳
○ ہم نے بھلا کس سے کہا ۱۳۵

○ دلوں کی عرضِ تمنا کو اور کیا کہنا ۱۳۷
○ گلوں کو چھو کے شمیم دعا نہیں آئی ۱۳۹
○ جو مہرباں الفاظ تھے کس نے سنے کس نے کہے ۱۴۱
○ اَن جانے گگن کا نام نہ لو ۱۴۳
○ تم نے ایسا کیوں سوچا تھا ۱۴۶
○ لَو دے اُٹھے جو اشک تو حسنِ بیاں کہوں ۱۴۸
○ اندازِ نقشِ پا ۱۵۰
○ دوسرا قدم ۱۵۲
○ رخصت ۱۵۴
○ کہتے ہیں ۱۵۷
○ آنکھوں میں روپ صبح کی پہلی کرن سا ہے ۱۵۹
○ دیوار ۱۶۱
○ اندھیرا اتنا بڑھا کہکشاں اتر آئی ۱۶۲
○ بلاوا ۱۶۴
○ خود اپنی ذات سے ہیں شناسائیاں تو ہیں ۱۶۷
○ نگاہ اوٹ رہوں، کاسۂ خبر میں رہوں ۱۶۹
○ اپنا صحرا ابھی ساتھ ہی لائی ۱۷۱
○ غزالاں تم تو واقف ہو ۱۷۳

منم کہ با جگرِ تشنہ می نوردم راہ
بہ وادیٔ کہ خضر کوزہ و عصا انداخت

(غالبؔ)

مسجدِ اقصیٰ

ایسا اندھیر تو پہلے نہ ہُوا تھا لوگو!
لَو چراغوں کی تو ہم نے بھی لرزتے دیکھی
آندھیوں سے کبھی سورج نہ بجھا تھا لوگو!

آئینہ اتنا مکدّر ہو کہ اپنا چہرہ
دیکھنا چاہیں تو اغیار کا دھوکا کھائیں
ریت کے ڈھیر پہ ہو محمِلِ ارماں کا گماں
منزلیں کاسۂ دریوزہ گری بن جائیں

قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گزرگاہوں میں
لُوٹنے والوں نے کیا عزمِ سفر بھی لُوٹا؟

دجلۂ خوں تو نئی بات نہیں ہے، یہ کہو
وہ جو ڈوبا ہے، سفینہ ہے کہ ساحل ڈُوبا

جادۂ شوق کہ ہے مسجدِ اقصیٰ پہلے
دل بھی قبلہ ہے، یہ قبلہ نہ ڈھا تھا پہلے

نامناسب تو نہ تھا شعلہ بیاں بھی ہوتے
تم مگر شعلہ بہ دل، شعلہ بہ جاں بھی ہوتے

تم تو خورشید بکف بنتے سرِ بازارِ وفا
کیوں حریفِ نگہِ چشمِ تماشا نہ ہوئے

کس کی جانب نگراں تھے کہ لگی ہے ٹھوکر
تم تو خود اپنے مقدّر کی عناں تھامے تھے

اس صحیفے میں ندامت کہیں مفہوم نہ تھی
اس خریطے میں ہزیمت کہیں مرقوم نہ تھی

رَن سے آتے تھے تو باطبلِ ظفر آتے تھے
ورنہ نیزوں پہ سجائے ہوئے سر جاتے تھے

مِٹ نہ پائے تھے بگولوں سے نقوشِ کفِ پا
ان رہوں میں ہیں رسولوں کے نقوشِ کفِ پا

محترم ہے مجھے اس خاک کا ذرّہ ذرّہ
ہے یہاں سرورِ کونین کے سجدے کا نشاں

اِس ہوا میں مرے آقا کے نفس کی خوشبو
اِس حرم میں مرے مولا کی سواری ٹھہری
اِس کی عظمت کی قسم ارض و سما نے کھائی
تم نے کچھ قبلۂ اوّل کے نگہبان! سنا؟
حرمتِ سجدہ گہہِ شاہ کا فرمان سنا؟
زندگی مرگِ عزیزاں کو تو سہہ جاتی ہے
مرگِ ناموس مگر ہے وہ دہکتی بھٹّی
جس میں جل جائے تو خاکسترِ دل بھی نہ ملے
اور تپ جائے تو کندن ہے وجودِ انساں
پھر یہ پگھلے ہوئے لمحات گراں تا بہ گراں

آپ مینارۂ انوار میں ڈھل جاتے ہیں
عرش سے خاک نشینوں کو سلام آتے ہیں

خارزاروں کو کسی آبلہ پا کی ہے تلاش
آج پھر رحمتِ یزداں کا سزاوار آئے

وادیٔ گُل سے ببولوں کا خریدار آئے
دلق پوش آئے، غلاموں کا جہاندار آئے

پا پیادہ کوئی پھر قافلہ سالار آئے
ریگ زاروں میں کوئی تشنہ دہن آئے

ہوش والو! کوئی تلقینِ جنوں فرمائے

۱۹۶۰ء

١٩٦٨م

رنگ کے رُوپ ہزار

کہیں سچّا اُجلا رنگ
کہیں پھیکا پھیکا رُوپ
کہیں چھاؤں رہے کہیں دُھوپ
کبھی زلفوں جیسا جیون بھر کے اندھیاروں کا رنگ
کبھی چاندی جیسی لٹ اور کرنوں جیسا رنگ
کوئی جس کا بھاؤ نہ مول
یہی سُوکھے ہونٹوں ٹوٹے پھوٹے بول
یہی رنگ رچے ہے ارمانوں کے تول

کہیں آنکھیں ساون بھادوں
کہیں جیٹھ اساڑھ کی پیاس
کہیں پروائی کی بھینی بھینی پھوار
کہیں اوس بنے کہیں آس
کہیں رنگ جمے اور خوب جمے
کہیں بدلے سو سو بھیس
کبھی اپنا گاؤں کا گاؤں
کبھی گھر آنگن پردیس
رہے رنگ کے روپ ہزار
رنگ کے راز نگاہوں پہ کھُلیں یا نہ کھُلیں
رات کی گود میں ہر آنکھ خمار آلودہ

جس طرح رنگِ خزاں رنگِ بہار آلودہ
اجنبی روپ میں گھلتا ہوا پہچان کا رنگ
آئینے آئینے بکھرا ہُوا انسان کا رنگ

رنگ سو جائے تو خوابوں کا اُجالا نہ رہے
غم کو اندازۂ احسانِ تمنّا نہ رہے
دل کے بس میں بھی مداراتِ مسیحا نہ رہے

وحشتِ جاں سے کبھی نامہ و پیغام نہ ہو
پوری بستی میں کوئی صاحب الہام نہ ہو
رنگ وہ زلف کہ چھٹکے تو گھٹا کہلائے
راہ دکھلائیں مہکتے ہُوئے روشن سائے

فرض ہوتا ہے یہاں اوس کے قطروں سے وضو
رنگ جاگا ہے تو بیدار ہوئے اہلِ سبو
رنگ پختہ ہو تو صحرا میں شہیدوں کا لہو
رنگ سہمے ہوئے ہاتھوں میں عزیمت کا دیا
ڈوبتے چاند سے خورشید کا پیمانِ وفا
رنگ چمکا ہے تو نکھرا ہے فسوں کا رشتہ
رنگ کھو جائے تو کھو جائے جنوں کا رشتہ
آنکھ میں ہے تو بہر رنگ شرار آلودہ
آنکھ سے گر کے مگر رنگ غبار آلودہ

۱۹۶۸ء

○

آگے حریمِ غم سے کوئی راستہ نہ تھا
اچھا ہُوا کہ ساتھ کسی کو لیا نہ تھا

دامانِ چاک چاک گلوں کو بہانہ تھا
دل کا جو رنگ تھا وہ نظر سے چھپا نہ تھا

رنگِ شفق کی دُھوپ کھِلی تھی قدم قدم
مقتل میں صبح و شام کا منظر جُدا نہ تھا

کیا بوجھ تھا کہ جس کو اُٹھائے ہُوئے تھے لوگ
مُڑ کر کسی کی سمت کوئی دیکھتا نہ تھا

کچھ اتنی روشنی میں تھے چہروں کے آئنے
دل اُس کو ڈھونڈتا تھا جسے جانتا نہ تھا

کچھ لوگ شرمسار، خدا جانے، کیوں ہُوئے
اپنے سوا ہمیں تو کسی سے گلہ نہ تھا

ہر اِک قدم اُٹھا تھا نئے موسموں کے ساتھ
وہ جو صنم تراش تھا، بُت پوجتا نہ تھا

جس در سے دل کو ذوقِ عبادت عطا ہُوا
اُس آستانِ شوق پہ سجدہ روا نہ تھا

آندھی میں برگِ گُل کی زباں سے ادا ہُوا
وہ راز جو کسی سے ابھی تک کہا نہ تھا

۱۹۶۸ء

آج بھی

ہم نے جانا کہ ہم
اپنے ہر قرض سے اب سبکسار ہیں
ہر تبسّم کی قیمت ادا کر چُکے
دل سے عذرِ وفا کر چُکے
عزم ترکِ خطا کر چُکے
اب تو جینے کے ہم بھی سزاوار ہیں

اور یہ دل کہ ضدی ہے، نادان ہے
آج کے دور میں
جب خلوص و وفا و محبّت بھی فرمان ہے
آنسوؤں تک کی قیمت ہے، میزان ہے
اور یہ دل — اسے آج بھی
ایک بے ساختہ، بے محابا تبسّم کا ارمان ہے

۱۹۶۸ء

اے مصحفِ سادہ...

اے مصحفِ سادہ کوئی فرمانِ تمنّا!
اب رسمِ مدارات، دعائیں نہ سبیلیں
کافی ہیں نگاہوں کو نگاہوں کی فصیلیں
اب فاصلۂ حدِّ ادب راز نہیں ہے
اب عرضِ سخن، تابِ نظر کچھ بھی نہیں ہے
وہ یاس کا عالم ہے، خبر کچھ بھی نہیں ہے
شہپر کو ابھی حسرتِ پرواز نہیں ہے
کچھ رنج نہ شکوہ ہے کوئی داد نہ فریاد

وہ شور کہ اب کوئی بھی آواز نہیں ہے
بے ساختہ انکار کی جُرأت بھی نہیں ہے

وہ منزلِ عرفاں ہے کہ حیرت بھی نہیں ہے
اب مرحلۂ نکہتِ گُل آئے نہ آئے

اب نکہتِ گُل نامۂ محبوب نہیں ہے
بے چین کرن کلبۂ احزاں سے نہ جھجکے

یادوں کے لیے اب کوئی مہمیز نہ ہوگی
اب درد کی سوغات سنبھالی نہیں جاتی

آجائے ہوا کا جو کوئی شوخ سا جھونکا
دستک میں کسی ناز کا انداز نہ ہوگا

اب دل کے دھڑکنے کی صدا تیز نہ ہوگی
فرقت میں ابھی رنگِ حنا تک نہیں جلتا
مژگاں پہ سرِ شام دیا تک نہیں جلتا
اب وحشتِ دل، شورشِ غم کچھ بھی نہیں ہے
اب حرمتِ جاں، دیدۂ نم کچھ بھی نہیں ہے
اب آئے تو آئے مرے خوابوں کا مسیحا!

۱۹۶۸ء

○

مطلوب زندگی کو ابھی امتحاں نہیں
اب تک متاعِ درد سے دل بدگماں نہیں

جو برگِ خشک تند ہواؤں کی زد پہ تھا
وہ آشنائے راز کہاں ہے کہاں نہیں

دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اک آشنا سی لَو
سوچو تو آس پاس کوئی راز داں نہیں

چہروں کا رنگ دیکھ، نگاہوں کی بات سُن
وہ بے زباں نہیں جو ترے ہم زباں نہیں

ہر لمحہ اک صدی سا گزارا ہے کرب نے
دل کو ندامتِ نفس رائیگاں نہیں

اک دوسرے کا حال، چلو ہم ہی پوچھ لیں
شب کا سفر طویل ہے، افسانہ خواں نہیں

دیوارِ شب وہی ہے، جمالِ سحر وہی
شیشے نہیں رہے ہیں کہ سنگِ گراں نہیں

گزرے ہزار قافلے جس راہ سے ادا
اُس راستے میں ایک بھی سنگِ نشاں نہیں

۱۹۶۸ء

○

پھول صحراؤں میں کھلتے ہوں گے
آ کے بچھڑے ہوئے ملتے ہوں گے

کتنی ویران گزرگاہوں سے
سلسلے خواب کے ملتے ہوں گے

آس ٹوٹے گی نہ جی سنبھلے گا
چاکِ دل بھی کہیں سِلتے ہوں گے

صبح زنداں میں بھی ہوتی ہو گی
پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

ہم بھی خوشبو ہیں، صبا سے کہیو
ہم نفس روز نہ ملتے ہوں گے

اجنبی شہر میں اپنوں سے ادا
اتفاقاً بھی تو ملتے ہوں گے

۱۹۶۸ء

مزاج و مرتبۂ چشمِ نم کو پہچانے
جو تجھ کو دیکھ کے آئے وہ ہم کو پہچانے

ملا ہے درد ہمیں دردِ آشنا کی طرح
بھلا ہُوا کہ خلوصِ کرم کو پہچانے

ہزار کوس نگاہوں سے دل کی منزل تک
کوئی قریب سے دیکھے تو ہم کو پہچانے

یہ خود فریب اجالے، یہ ہاتھ ہاتھ دیئے
دیئے بجھاؤ کہ انسان غم کو پہچانے

بہت دنوں تو ہواؤں کا ہم نے رُخ دیکھا
بڑے دنوں میں متاعِ قلم کو پہچانے

۱۹۶۸ء

آبلہ پا

دیدار کی ساعت نہ جدائی کی گھڑی ہے
الزام ہی الزام ہے دلداریٔ محمل
ہر موجۂ ریگِ گزراں آپ ہے ساحل
سنگِ سرِ راہ ہے نہ غبارِ سرِ منزل
زنجیرِ بیاباں مرے پیروں میں پڑی ہے

۱۹۶۸ء

دل ضدّی ہے

دل ضدّی ہے
اس کو کچھ نہ کہو
آئینوں سے چہرے مانگے
اور ناکام پھرے
چہروں میں آئینے ڈھونڈے
اور بدنام رہے
زخموں کی ٹیسیں سہتا ہے
کرچیں، کنکر، کانٹے چُن کر

خوش رہتا ہے
رہ لینے دو
جانے کن لہروں بہتا ہے
جو کہتا ہے کہہ لینے دو!
اس کو کچھ نہ کہو!

۱۹۶۸ء

○

وہ اعتمادِ خوئے ستم بھی بہانہ ساز
یہ افتخارِ کرب و الم بھی بہانہ ساز

کچھ بُت بنا لیے ہیں چٹانیں تراش کر
دل بھی بہانہ ساز ہے، غم بھی بہانہ ساز

خود اپنے راستوں میں جلاتے رہے چراغ
عذرِ وفا و دیدۂ نم بھی بہانہ ساز

وہ بھی حصارِ ذات میں تنہا تھا آج تک
دلداریٔ نگاہِ کرم بھی بہانہ ساز

کچھ دور ساتھ ساتھ تھے، اتنا تو یاد ہے
صحرائے غم میں نقشِ قدم بھی بہانہ ساز

سب سے بڑا فریب ہے خود زندگی ادا
اس حیلہ جُو کے ساتھ ہیں ہم بھی بہانہ ساز

۱۹۶۸ء

کہتے ہیں کہ اب ہم سے خطاکار بہت ہیں
اک رسمِ وفا تھی سو وفادار بہت ہیں

راہوں میں کوئی آبلہ پا اب نہیں ملتا
رستے میں مگر قافلہ سالار بہت ہیں

دیوار سے ڈھائے نہ گئے درد کے رشتے
اب بھی غمِ ہجراں کے طلبگار بہت ہیں

کیوں اہلِ وفا، زحمتِ بیداد نگاہی
جینے کے لیے اور بھی آزار بہت ہیں

ہوتا ہے ادا آج بھی زخموں سے چراغاں
ارزاں ہے جو شے، اس کے خریدار بہت ہیں

۱۹۶۸ء

کوئی آئینہ

تو کہ ہے شناورِ تشنہ لب
(جو وقار و حرمتِ داستان
وہی حرفِ مہمل و بے زباں)
تری تشنگی نہ مٹا سکا
کوئی جامِ جم، کوئی بادیہ
تو جمالِ دلبرِ روز و شب
تو شعارِ حیرتِ اوّلیں
تو ضمیرِ ساعتِ واپسیں

تو تبسمِ دردِ دعائے دل
تو قبائے لالہ حنائے گل

یہ جمالِ جاں غمِ محترم
یہ زوالِ جاں رمِ دم بہ دم

ترے پاس کاسہ چشم میں
کئی شب چراغ نہاں رہے

وہ بقائے خاکِ راہ کا قرض بھی
وہ جو نقدِ جاں سے گراں رہے

یہ جو گونج سی ہے زماں مکاں
یہی تہہ بہ تہہ تری خامشی

تری روشنی تری تیرگی
تری تشنگی ترا راحلہ

تو وہ رہ نوردِ رہِ طلب
کبھی چاک چاک ہے پیرہن
کبھی داغ داغ ہے رُوح و تن
تو حریف بھی ہے، حبیب بھی
تو مسیح بھی ہے، صلیب بھی
کبھی چاکِ دل کو رفو کیا
کبھی نذر خونِ گلو کیا
یہ خروشِ جاں یمِ بے کراں

یہ سکوتِ جاں لبِ نوحہ خواں
ہے سیاہئ دلِ اہرمن
ہے صداقتِ لبِ انبیا
جہاں قدسیوں کے جلے ہیں پر
وہیں ثبت ہے ترا نقشِ پا
تجھے کون آ کے بتائے گا
تجھے کون راہ دکھائے گا
کوئی آئینہ، کوئی آئینہ

۱۹۶۸ء

سوادِ شب

لوگ کہتے ہیں کہ رونے سے سکوں ملتا ہے
آج کی رات ہے تاریک، مسافت بھی کڑی
جیسے سینے پہ کوئی برف کی سِل آن پڑی
اب نہ دیدار کا مژدہ، نہ جُدائی کی گھڑی
اک خلش سی ہے جسے نام کوئی دے نہ سکوں
نہ رفاقت، نہ مروّت، نہ محبّت، نہ جنوں
کچھ تو ہو گرمیٔ محفل کا بہانہ ساتھی
جی بہل جائے گا، زخموں کی نمائش ہی سہی

بارشِ سنگ سے ہر پیکرِ گل زخمی ہے
کہیں آدرش ہے گھائل کہیں دل زخمی ہے

سوچتی ہوں کہ کہوں بھی تو بھلا کس سے کہوں
اِن میں وہ سنگِ ملامت بھی تو شامل ہوں گے
جن کی زد پر سبھی اپنے ہیں کوئی غیر نہیں
پھول سے ہاتھ میں پتھّر کی خراشیں ہی گِنوں

درد چمکا ہے اندھیرے میں تو جی ٹھہرا ہے
لوگ کہتے ہیں کہ رونے سے سکوں ملتا ہے

میں وہ بے صبر کہ جینے کے بہانے ڈھونڈوں

ایک غنچہ نظر آئے تو بہاراں سمجھوں
مَیں تو آنسو کو بھی رہبر کہوں، منزل جانوں
اپنے بیگانے کی تمیز کہیں ہوتی ہے
پھُول جس شاخ پہ مہکے وہ حسیں ہوتی ہے
جس کسی لفظ میں پائی ہے صداقت کی مہک
مَیں نے اس لفظ کے قدموں پہ جبیں رکھ دی ہے
جس کسی آنکھ میں دیکھی ہے مروّت کی جھلک
مَیں نے اُس آنکھ کی حرمت کی قسم کھائی ہے
کسی ماتھے پہ دمکتی ہوئی شبنم سی کرن
اُجلا اُجلا سا کسی لہجے کا بے ساختہ پن

کوئی نادان تمنّا، کوئی معصوم لگن
مجھ کو انساں کے تقدس کا دلاتے ہیں یقیں
زندگی دستِ طلبگار سے کچھ دُور نہیں
اب کے تقدیر انھیں ہاتھوں سے زنجیر کرو
جاں نگارو! کوئی چارہ کوئی تدبیر کرو
تیشۂ حرفِ شکایت سے کوئی رات کٹی
آج کی رات ہے تاریک، مسافت بھی کڑی

۱۹۶۸ء

○

جی نہ چاہا اُسے بھلانے کو
اک گھروندا رہا ہے ڈھانے کو

اک ستارہ مژہ پہ روشن ہے
اک دیا رہ گیا بجھانے کو

ہاتھ کانٹوں سے کر لیے زخمی
پھول بالوں میں اک سجانے کو

ریزہ ریزہ بکھر گیا انساں
گھر کی ویرانیاں جتانے کو

آنسوؤں کو ترس گئیں آنکھیں
لوگ ہنستے رہے دکھانے کو

سانس کی بات ہو کہ آس ادا
سب کھلونے تھے ٹوٹ جانے کو

۱۹۶۸ء

الفتح

ابھی کل کی بات ہے ہم نوا!
مرے پاس میری نگاہ تھی
جو وفا رہی، جو پناہ تھی
وہ نگاہ کشتِ فسونِ جاں
ترے درد سے مرے درد تک
وہی رنگ تھا، وہی روپ تھا
کبھی زخم زخم پہ نوحہ خواں
کبھی بس تجاہلِ عارفاں

جو کلی کلی کو نسیم تھی
جو رحیم تھی، جو کریم تھی
وہ سفیرِ جاں، وہ خبیرِ دل
ترا آئینہ، مرا آئینہ

وہ نگاہ تیری نگاہ تھی
وہ نگاہ میری نگاہ تھی

یہ مسافرانِ برہنہ پا
اسی اک نگاہ کی ہیں جھلک
وہیں ہیں لباسِ شعاع میں
جہاں راکھ اُڑ تی تھی پلک پلک

یہ مثیلِ ذرّہ ناتواں
جو زمیں کی کوکھ سے پھوٹ کر
بہ جمالِ غم، بہ فسونِ جاں
بہ کرشمہ ہائے جنونِ جاں
بہ ہوائے رنجِ نمو رہا
ہے دراز درد کا سلسلہ
یہ مسافرانِ برہنہ پا
یہ بلاکشانِ خجستہ پا
یہی طالبانِ نگارِ صبح
یہی وارثانِ شرارِ صبح

پئے کوہسارِ افق بڑھے
لب جوئبارِ شفق چلے

چلے ہیں یہ کہ ہے روشن ابھی خیال کی لَو
اُسی نگاہ کی مشعل، اُسی جمال کی لَو
یہیں کہیں سپرِ آفتاب کھوئی تھی
جہاں پہ ڈوب گئی ہے، وہیں سے ابھرے گی
شفق سا رنگ کھلا ہے بدن بدن کے لیے
گلوں نے آج تلک چاکِ پیرہن نہ سیئے
لہو لہو ہیں جو چہرے تو رنگ زرد نہیں
دریدہ پیرہنوں کی جبیں پہ گرد نہیں

۱۹۶۸ء

سفرنامه

صنم کدوں کی سرزمیں

(بنکاک)

صنم کدوں کی سرزمیں
صنم کدہ بنی ہوئی
سجی ہوئی
سنگھار روپ جیسے شاخِ گل سی دیو داسیاں
نشاطِ رنگ موج موج نغمہ گر فسانہ خواں
وہ روشنی کہ آنکھ اُٹھا کے دیکھنا محال ہے
وہ رہگزر کہ راہ میں بچھی ہوئی ہے کہکشاں
وہ رات جس پہ دن کا ہو گماں

یہ رنگ و نور کا سماں

کہ جنّتِ جمال ہے

سکونِ دل قرارِ جاں

(سکونِ دل قرارِ جاں

مرے نصیب میں ابھی کہاں)

رچی ہوئی بہار کی قدم قدم پہ لَو

یہ خیرگی کا دشتِ بے کراں

کہ ہانپنے لگے نگاہِ راہرو

مَیں اجنبی دیار سے بھلا

کہوں تو کیا کہوں

نہ جانے میرے گھر ابھی

دیا جلا بھی یا نہیں جلا۔!

۱۹۶۸ء

رسمِ تعارف

(ٹوکیو)

اے بہاراں بہاراں نگر !
کہکشاں کہکشاں راہ میں
ہم بیاباں نورد آتے ہیں
تیرے سرشار جلووں کی درگاہ میں
ہم اندھیری رُتوں کے سفیرانِ درد آتے ہیں
رات کے درد سے تو بھی آگاہ ہے
تیرے ماتھے پہ بھی گرد ہی گرد تھی
تیری جھولی میں بھی راکھ ہی راکھ تھی

آنچلوں کی دھنک بجھ گئی
عارضوں کی شفق بجھ گئی
تو نے جھیلیں کڑے وقت کی زہر افشانیاں
جنگ اور موت کی قہر سامانیاں
تیرا ہیروشیما
زخم سا زخم تھا
اے نگارِ حیات آشنا!
رات بھی کٹ گئی
گرد بھی چھٹ گئی
زخم بھی بھر گئے

ہے جمالِ تمنّا ثبات آشنا
تیری کرنوں کا رقصِ صبا زندہ ہے
تیرے پھُولوں کا رنگِ حنا زندہ ہے
تیری گلیوں میں، اے وادئ مہرباں
زندگی سے ہمارا تعارف ہُوا — !

١٩٦٨ء

تضادِ رنگ

(واشنگٹن)

وہی نقیبِ صبحِ نَو
کہ رُوئے آفتاب تیرگی کی اوٹ ہے
وداعِ شب کی ساعتیں
(وہ جن کا انتظار عمر بھر رہا)
وہی شفق کی آبجو
وہی سفینۂ صبا
وہی جمالِ رُوبرو
وہی سیاہ پیرہن کی سرخ و زرد گوٹ ہے

ہزار کوس میرے ساتھ چل کے آئی ہیں
مری سحر کی سرخیاں
مری طویل رات کی سیاہیاں
بہار کی ہنسی وہی
خزاں کی بے لبی وہی
وہی طلب — کہ نازجُو
وہی حیا کی آرزو
وہی نگاہ کے فسوں کا رنگ ہے
وہ رنگ سرخ وارغواں
جو میرے خوں کا رنگ ہے

جو میری آنچ، میرے دل سے پھوٹتا رہا
تری جبیں پہ فخر و انبساط و زندگی کی لَو
غرورِ شہ پری کی ضَو
تری سحر بھی گُلعذار و لالہ رَو
مری سحر بھی میرے عکسِ خواب سے لہو لہو
شفق نہادِ رنگ ہے
اُفق سوادِ رنگ ہے
یہ اتّصالِ رنگ بھی مگر تضادِ رنگ ہے
تری سحر کے پاس میرے دن کی روشنی نہیں!

۱۹٦٨ء

زخم تماشا

(واشنگٹن)

نارسا دستِ تمنّا کی طرح

آشنا زخمِ تماشا کی طرح

سُرخ ہوتا ہے سحر کا آنچل

اجنبی منبر و محراب و دریچہ تاباں

ساعتِ طالعِ بیدار پہ نازاں نازاں

اپنے قد سے بھی ذرا اور بلند و بالا

سُورج اُبھرا تو جبینوں سے کرن بھی پھُوٹی
دُھوپ چمکی ہے تو آنگن میں اجالا اُمڈا
اور کچھ دُور —— بہت دُور نہیں
شوخ رنگین اُجالوں کے قریں
کتنے گھرے ہیں دُھوئیں کے بادل
ہم نے تو پھر بھی کھلونوں سے بہلنا چاہا
شہرِ گُل میں ہمیں خوشبوئے وفا یاد آئی
ارضِ کشمیر سے ویتنام تلک
امن کے خواب سے نیپام تلک
ماند پڑتی ہُوئی چہروں کی جلا یاد آئی

دیس پردیس کے زخموں کی حنا یاد آئی
دل کی کیا بات، سدا سے پاگل
سُرخ ہوتا ہے سحر کا آنچل!

(واشنگٹن) ۱۹۶۹ء

دید کا لمحہ

(مسجد حضرت ایوب انصاری) استنبول

دید کا لمحہ مرے پاس اکیلا آیا
تو جہاندارِ نظارہ تھا مگر ساتھ نہ تھا
مَیں وہ باہوش کہ دیوار بنی جاتی تھی
خامشی عرصۂ پیکار بنی جاتی تھی
جانے اس وقت تجھے کس کی تمنّا ہو گی
چاندنی چھٹکی ہے، کس گھر کا اجالا ہو گی
تو نے اِس آن نہ جانے کسے دیکھا ہو گا
کون سا رنگ ترے ناز کو جچتا ہو گا

نازبردار تھی اُس وقت کہ مسحور تھی میں
تو مرے سامنے آیا تو بہت دور تھی میں
عکسِ خورشیدِ جگر تاب تھا مہ پارا تھا
میری پلکوں پہ دہکتا ہُوا انگارا تھا

یہ خرابہ ترے ہوتے ہوئے آباد نہ تھا
دید کا لمحہ مجھے یاد تھا، تُو یاد نہ تھا

اور پھر دل نے وہ بھولی ہُوئی آواز سُنی
بیعتِ درد کی کس ناز سے تجدید ہُوئی
وہ فسوں ساز، جنوں ریز، سکوں بار صدا
وہ جو ہر جذبۂ نامصلحت اندیش کے ساتھ
وقت کے دشتِ بلاخیز میں کھو جاتی ہے

اور دانائی کا بوسیدہ لبادہ اوڑھے
راہرو سنگِ نشاں ڈھونڈ تا رہ جاتا ہے
وہ جو کھوئی تھی مری روح کے سنّاٹوں میں
آپ ہی آپ مرے دل میں اُترنے آئی
جانے یہ میں نے کہا، تُو نے کہا، کِس نے کہا
شُعلۂ رُخ کو کبھی آئینہ پردا نہ ہُوا
میں محبّت ہوں، محبّت میں کہاں اندیشے
تو صداقت ہے، صداقت کے ہزاروں چہرے

۱۹۶۹ء

١٩٦٩ء

١٩٧٠ء

ابھی تو شب خوں نہیں ہُوا ہے

ابھی تو ردِّ صباحِ افسوں نہیں ہُوا ہے
ابھی تو شب خوں نہیں ہوا ہے
ابھی گلوں کی برہنگی کو
ردائے تمکیں نہیں ملی ہے
حصارِ زنداں میں نکہتِ گُل
ابھی مقیّد نہ ہو سکی ہے
ابھی نگہ بے زباں نہیں ہے
ابھی وفا بدگماں نہیں ہے

ابھی ترے مو قلم کی جنبش
دلوں کو مرہم بنی ہوئی ہے
خود ابنِ مریم بنی ہوئی ہے
ابھی مغنی کے ہر نفس سے
چراغ جلتے ہیں انجمن میں
ہزار جلووں کی دھڑکنیں ہیں
ہمارے لفظوں کے پیرہن میں
یہ خود کلام و عجیب لمحے
جو سانس لیتے ہیں پھول بن میں
جنوں کی بے صبر چاندنی پر

خرد کے سائے نہیں پڑے ہیں
اچھوتے خوابوں کی اوڑھنی پر
لہو کے چھینٹے نہیں پڑے ہیں
ابھی تو ارمان جاگتا ہے
ابھی ہے آئینہ مصحفِ رُخ
ہر ایک پیمان جاگتا ہے
متاعِ غم ہے ابھی سلامت
کریم و غفّار ہے محبّت
بڑی مقدّس ہے یہ امانت
ہمارے مہماں اِس ایک شب تو نجوم اور ماہتاب ہوں گے

لہو میں رقصاں ہیں جو شرارے
وہ رشکِ صد آفتاب ہوں گے
اس ایک دن تو دلوں کی راہیں دلوں تلک استوار ہوں گی
یہ چند لمحے، یہ چند گھڑیاں
حیات سے مستعار ہوں گی
ہماری اپنی شمار ہوں گی

۱۹۷۰

○

گفتار میں بے ساختہ پن اب بھی وہی ہے
چُپ ہیں کہ تب و تابِ سخن اب بھی وہی ہے

لفظوں کے تراشیدہ صنم چپ تو نہیں ہیں
لہجے کی درخشندہ کرن اب بھی وہی ہے

اب بھی وہی میلے ہیں سرِ دشتِ تمنّا
حیران غزالوں کا وطن اب بھی وہی ہے

بدلے تو نہیں ہیں وہ دل و جاں کے قرینے
آنکھوں کی جلن دل کی چبھن اب بھی وہی ہے

کیا اب بھی دیئے نقشِ کفِ پا کے بجھیں گے
ہر سلسلۂ کوہ و دمن اب بھی وہی ہے

اوراقِ گُل و لالہ بہم اب بھی نہیں ہیں
اندازِ بہالانِ چمن اب بھی وہی ہے

اب کے بھی علاجِ دلِ خود دار نہ ہو گا
اے چارہ گرو! درد شکن اب بھی وہی ہے

طغیانِ انا ہو کہ سراسیمگیٔ جاں
یارب! تراشہ پارۂ فن اب بھی وہی ہے

۱۹۶۹ء

○

یہ حکم ہے تری راہوں میں دوسرا نہ ملے
شمیمِ جاں! تجھے پیراہنِ صبا نہ ملے

بجھی ہوئی ہیں نگاہیں، غبار ہے کہ دھواں
وہ راستہ ہے کہ اپنا بھی نقشِ پا نہ ملے

جمالِ شب مرے خوابوں کی روشنی تک ہے
خدانکردہ چراغوں کی لَو بڑھا نہ ملے

قدم قدم مری ویرانیوں کے رنگ محل
دلوں کو زخم کی سوغات خسروانہ ملے

تم اس دیار میں انساں کو ڈھونڈتی ہو جہاں
وفا ملے تو بہ احساسِ مجرمانہ ملے

گئے دنوں کے حوالے سے تم کو پہچانا
ہم آج خود سے ملے اور والہانہ ملے

کدھر سے سنگ چلا تھا ادا کہاں پہنچا
جو ایک ٹھیس سے ٹوٹیں، انھیں بہانہ ملے

۱۹۶۹ء

○

اوروں سے داستانِ بہار و صبا کہیں
دل بھی تو ساتھ ساتھ ہے، اس دل سے کیا کہیں

جو شاخِ گُل ہے، آج بھی کاسہ بدست ہے
کس دل سے ہم سیاستِ آب و ہوا کہیں

آنگن ہے لالہ رنگ شہیدوں کے خون سے
پت جھڑ میں شاخ شاخ کو دستِ دعا کہیں

اس دورِ بے وفا میں یقیں کس کو آئے گا
ہم تو لہو کے رنگ کو رنگِ حنا کہیں

بدظن نہیں ہوتے ہیں جمالِ حیات سے
اب تک تری نگہ کو وفا آشنا کہیں

ہم ساتھ اپنی شام و سحر لے کے آئے تھے
شہرِ نگار و گل کی حکایات کیا کہیں

آنکھیں اداس اداس ہیں چہرہ بُجھا بُجھا
شامِ فراق! پھر بھی تجھے مرحبا کہیں

۱۹۶۹ء

میری مجبور وفا

اور تو کیا تھا مرے پاس بھلا
نازِ تمنّا کے سوا
میرے خوابوں کے سحر رنگ کنول
میرا سرمایہ تھے
میری مجبور وفا!
آج وہ بھی سرِ مقتل پہنچے!

۱۹۷۰ء

لہو لہو راستے

آؤ صف بستہ بہ تکریم کھڑے ہو جاؤ
آؤ اُس غمزۂ غمّاز کا دیدار کرو
جس کو پُوجا ہے، اُسی بُت کا نظارا ہوگا
آج کے روز تو آنکھوں پہ نہ پردا ہوگا
اب کہاں ہے کہ متاعِ دل و جاں لے کے چلیں
ہاتھ خالی ہیں مگر جنسِ گراں لے کے چلیں
اپنا سرمایہ یہ داماں، یہ دریدہ آنچل
اس قدر سادہ نہیں، اتنا بھی کم مایہ نہیں

ہے یہ تاریخ کے بے باک اجالوں کا امیں
اس کے ہر تار میں خورشید ٹکے ہیں، دیکھو
اب بھی روشن ہیں وفاؤں کے مقدّس آنسو
میرے قاتل، ترے ہاتھوں سے ٹپکتا ہے لہو
اتنی ارزاں تو نہ تھی خونِ جگر کی سُرخی
تنگ داماں بھی نہیں میرا دریدہ پلّو
عہد در عہد مِلا دستِ حنائی کو خراج
نجد در نجد ہُوا خاک نصیبوں کا علاج
روز تصنیف ہوئے عرضِ وفا کے نسخے
عصر در عصر چلے نازِ بتاں کے چرچے

بے نوا ہیں کہ تجھے صوت و نوا بھی دی ہے
جس نے دل توڑ دیئے اس کو دعا بھی دی ہے
وہ جو طوفاں کو سفینہ کبھی ساحل سمجھے
پورشِ قطرۂ شبنم سے خفا کیا ہوں گے
ایک بار اور حسابِ دل و دلدار کرو
نقدِ جاں نذر ہوئی، جنسِ یقیں لے کے چلو
حجلۂ ناز سے آتے ہیں بلاوے اب کے
آخری بار چلو — آخری دیدار کرو

۱۹۷۰ء

کس کس نے ساتھ چھوڑ دیا دھوپ چھاؤں میں
ذکرِ وفا نہیں ہے ہماری خطاؤں میں

موجِ ہوا بھی ریت کی دیوار بن گئی
ہم نے خدا تلاش کیا ناخداؤں میں

شاید ادھر سے قافلۂ رنگ و بُو گیا
خوشبو کی سسکیاں ہیں ابھی تک ہواؤں میں

اب کے صبا کی نرم مزاجی کو کیا ہُوا
بکھرے پڑے ہیں تازہ شگوفے ہواؤں میں

مقدور بھر جو راہ کا پتھر بنے رہے
وہ لوگ یاد آتے ہیں اکثر دعاؤں میں

ویرانیاں دلوں کی بھی کچھ کم نہ تھیں ادا
کیا ڈھونڈنے گئے ہیں مسافر خلاؤں میں

۱۹۷۰ء

گواہی

رفیقِ دشتِ تمنّا ! مسیحِ عرصۂ جاں
مرے حبیب! یہ دل تیرے ناز پر قرباں
مرے لہو سے تری پور پور ہے زخمی
سُلگ رہا تھا اِسی اِک دیئے سے میرا بدن
خدا نکردہ مری آنچ تجھ تک آ پہنچے

تو خود حریمِ محبّت، تو قبلہ گاہِ وفا
مجھے تو آتا ہے ہر رنگ زندگی کرنا

کبھی کو تو جو پشیماں ہُوا تو کیا ہو گا
مَیں بے نشاں بھی سہی، بے زباں بھی ہوں لیکن
میں حرفِ شوق بہ نامِ بیاضِ سادہ ہوں
مرے حبیب، مرے کج کلاہ، دیکھ تو لے
مَیں سر بکف تری چوکھٹ پہ ایستادہ ہوں
تری نگاہ نگاہوں سے کیوں نہیں ملتی
یہ خون فرض تھا مجھ پر، ادا کیا میں نے
یہ خون قرض تھا مجھ پر، چکا دیا مَیں نے

۱۹۷۰

○

نازِ وفا کا بُت بھی ہمیں توڑنا پڑا
لوگو! شکستِ دل سے بڑا سانحہ ہُوا

چاروں طرف تھی ریت، بہت تیز تھی ہوا
دل میں چھپا لیے ہیں تمہارے نقوشِ پا

خود پر بھی اجنبی کا شبہ ہو گیا ہمیں
اُس دوپہر نگر میں اندھیرا بلا کا تھا

یارب! مجھے بتا کہ مرے عہد کا مسیح
اپنی صلیب آپ کہاں تک اُٹھائے گا

پوچھے گی کس سے اب کے صبا گھر کا راستہ
ہم نے تو اپنا نقشِ قدم تک مٹا دیا

اب کے بھی ہاتھ ہاتھ فروزاں رہے چراغ
اب کے بھی فصلِ گُل کو رہا انتظار سا

میں بھی فرازِ کوہ سے پاتال تک گیا
سایا مرا گلی میں مجھے ڈھونڈتا رہا

۱۹۷۰ء

١٩٧١ء

١٩٧٢ء

ناپشیماں

تمھاری جستجو مجھے
کہاں کہاں لیے پھری
مجھے وہ دن بھی یاد ہے
بچھڑتی ساعتوں نے سسکیاں بھریں
رفاقتیں صدائیں دیتی رہ گئیں
"یہ نکہتوں کے قافلے
پلٹ کے پھر نہ آئیں گے
یہ اک سحر طلوع پھر کبھی نہ ہو سکے گی سوچ لو

اس ایک دن اس ایک شب
تمھاری حکمرانیوں میں ارض و مہر و ماہ ہیں
ستارے گردِ راہ ہیں
نیا افق نظر کی انتہا ہے، ابتدا نہیں
یہ لالہ گوں شفق طلسمِ رنگ کے سوا نہیں
کہاں چلیں —"
ہرے بھرے شجر کی مہرباں
اُداس چھاؤں دُور تک مجھے بتانے آئی تھی
کہ راہ میں فقط گھنے درخت ہی نہیں
بدلتے موسموں کی سختیاں بھی ہیں
دشتِ بے اماں بھی ہیں

مرے نحیف بازوؤں کو چُوم کر
مرے قدم پہ شاخ شاخ جھک گئی تھی پیار سے
"دہکتے ریگ زار میں
سراب بھی فرات بھی
فرات کے سبو میں تشنگی بھی ہے
لباسِ ذات میں ہے پُوری کائنات بھی
تو کائناتِ ذات کی شکست و بر ہمی بھی ہے
بکھر گئیں اگر تو کیا کرو گی تم
تمام کرچیاں نہ چُن سکو گی تم"
کلی کلی کی چشمِ تر
اُمنڈتے آنسوؤں کو پونچھ کر

دعائیں دیتی رہ گئی

یہ جانے کیوں مجھے یہ اعتبار تھا
مکینِ دل! صباحِ جاں!
تمھیں بھی میرا انتظار تھا
طویل رہ کے پیچ و خم
مرے فگار جسمِ ناتواں سے شرمسار ہیں
مسافتوں کی گرد سے
مری جبیں کا رنگ اور بھی نکھر گیا
صعوبتوں کی دھوپ میں
مرے غرور کا جمال اور بھی سنور گیا
تمھارے سامنے کھڑی ہوئی

میں داد خواہ بھی نہیں
کچھ اشتباہ بھی نہیں
تم آج بھی مرے ہر ایک خواب سے حسین ہو
کہ آج بھی مری نگاہِ شوق کا یقین ہو
تمھاری آرزو مجھے

جہانِ بے جہات میں

زماں زماں لیے پھری
مری طلب کا ناز آج تک شکست آشنا نہ تھا
وہ کونسا فسانہ تھا

جو میں نے مصحفِ نیاز میں لکھا نہ تھا
تم اس قدر خموش ہو کہ کیا کہوں

وہ دلنوازیٔ فسوں
خدانکردہ کس غبارِ مضمحل میں کھو گئی
تم آج میرے سامنے ہو میرے اپنے اجنبی!
نہ جانے آئینہ شکستہ ہے
کہ آج تھک گئی ہوں میں — !؟

○

حدودِ ذات کے صحرا میں کیوں گنواؤ مجھے
تمہارا خواب ہوں، تم تو نہ بھول جاؤ مجھے

صبا کی راہ میں ٹوٹیں گلوں کی زنجیریں
نمازِ عشق ہوں، معبد میں کیوں سجاؤ مجھے

تمام عمر کا حاصل ہے، بے رُخی ہی سہی
زہے نصیب! مقدّر کو سونپ جاؤ مجھے

تمہارا عہدِ وفا ہوں، تمہارا نازِ جنوں
تڑپ اُٹھو گے مرے زخم اگر دکھاؤ مجھے

یہ تیرگیِ سرِ مقتل بڑی غنیمت ہے
خود اپنے دیدۂ غمّاز سے چھپاؤ مجھے

مَیں معجزہ ہوں وفاؤں کی بیکرانی کا
ابھی ہے وقت، ابھی اور آزماؤ مجھے

یہ کیسا جبر ہے، حدِّ نگاہ بھی تم ہو
نظر اُٹھا کے جو دیکھوں، نظر نہ آؤ مجھے

پلک پلک پہ تمنّا کا قرض باقی ہے
حصارِ شب میں اَدا شوق سے جلاؤ مجھے

۱۹۷۱ء

○

نہ بام و دشت، نہ دریا، نہ کوہسار ملے
جنوں کی راہ تھی حالات سازگار ملے
لبوں پہ حرفِ شکایت بھی آ کے ٹوٹ گیا
وہ خود فگار تھے جو ہاتھ سنگبار ملے
اِدھر فصیلِ شبِ غم، اُدھر ہے شہرپناہ
صبا سے کہیو، وہی آ کے ایک بار ملے
یہ بے بسی تو مِرے عہد کا مقدّر تھی
دلوں کو داغِ تمنّا بھی مستعار ملے

ہتھیلیوں پہ چراغِ دعا سجائے ہوئے
ملے نگارِ بہاراں تو شرمسار ملے
کوئی تو راہِ تمنّا میں ہم سفر ہوتا
کوئی تو کوئے وفا میں خطا شعار ملے
محبّتوں سے تو پہلے ہی کیا توقع تھی
مروّتوں کے بھی دامان تار تار ملے
میں کیسے اپنے خدوخال آج پہچانوں
جو آئینہ ملے، آلودۂ غبار ملے
مری طلب کی یہ معراج ہے کہ عجز ادا
جدھر سے گزروں، وہی ایک رہگزار ملے

۱۹۷۱ء

شب چراغ آج کہاں سے لاؤں

شب چراغ آج کہاں سے لاؤں
کل اُجالے مری مژگاں پہ اتر آئے تھے
رات پُر ہول نہ تھی
قلب ویران نہ تھا
آئینوں نے غمِ جاناں کی شہادت دی تھی
آنکھ نے کوئے نگاراں کی بشارت دی تھی
شعلۂ خوں کے ایاغ آج کہاں سے لاؤں
شب چراغ آج کہاں سے لاؤں

اب یہ مژگاں ہیں کہ نیزے کی انی ہو جیسے
آسمانوں سے فقط خاک چھنی ہو جیسے

آئینے گرد ہوتے

دل ہے آپ اپنی صلیب

روزِ محشر بھی نہیں زحمتِ غم بھی نہ رہی
فرصتِ غم بھی نہیں رخصتِ غم بھی نہ رہی

۱۹۷۱ء

کیوں۔؟

تم جو قاتل نہ مسیحا ٹھہرے
نہ علاجِ شبِ ہجراں نہ غمِ چارہ گراں
نہ کوئی دشنۂ پنہاں
نہ کہیں خنجرِ سم آلودہ
نہ قریبِ رگِ جاں
تم تو اُس عہد کے انساں ہو، جسے
وادیٔ مرگ میں جینے کا ہنر آتا تھا

مدّتوں پہلے بھی جب رختِ سفر باندھا تھا
ہاتھ جب دستِ دعا تھے اپنے
پاؤں زنجیر کے حلقوں سے کٹے جاتے تھے
لفظ تقصیر تھے
آواز پہ تعزیریں تھیں
تم نے معصوم جسارت کی تھی
اک تمنّا کی عبادت کی تھی
پابرہنہ تھے تمہارے
یہی بوسیدہ قبا تھی تن پر
اور یہی سرخ — لہو کے دھبّے

جنھیں تحریرِ گُل و لالہ کہا تھا تم نے
ہر نظارہ پہ نظارگیٔ جاں تم کو
ہر گلی کوچۂ محبوب نظر آئی تھی
رات کو زلف سے تعبیر کیا تھا تم نے
تم بھلا کیوں رسن و دار تک آ پہنچے ہو
تم نہ منصور نہ عیسیٰ ٹھہرے — !؟

۱۹۷۱ء

○

آرزو صبا جیسی، پیرہن گلوں سا تھا
زندگی امانت تھی، درد خود مسیحا تھا

ہم اگر نہ آ جاتے، ساکھ ختم ہو جاتی
آئینہ جہاں بھی تھا، ریزہ ریزہ بکھرا تھا

دل کہاں دھڑکتا ہے پتھروں کے سینے میں
مڑ کے دیکھنے والو، کس کی سمت دیکھا تھا

تم بھی توڑ جاؤ گے ناتواں سہاروں کو
ہم بھی بھول جائیں گے، دل نے کب یہ سوچا تھا

آندھیوں میں بکھرا ہے اب ورق ورق جس کا
حرف حرف اس دل پر وہ صحیفہ اترا تھا

بس کہیں فصیلوں کے کچھ نشان باقی ہیں
شہر کس طرح اُجڑا، آگ تھی کہ دریا تھا

جادۂ تمنّا سے دار کی بلندی تک
جانے والے جا پہنچے، فاصلہ ہی کتنا تھا

ہم نے سونپ دی جس کو کائناتِ جاں اپنی
وہ خدا نہ تھا لیکن کس قدر اکیلا تھا

۱۹۷۱ء

کوئی پیماں نہیں

آج دامن کشاں کوئی پیماں نہیں
زخمِ جاں سے بھی گھر میں چراغاں نہیں
شہرِ دل کے لیے کوئی فرماں نہیں
آج ہر مہرباں ہاتھ ہے خوں چکاں
اب کوئی دشنۂ بے اماں
آستینوں میں پنہاں نہیں
رشتۂ دردِ فرسودہ زنجیر تھی
آج زنجیر توڑی گئی

پیار کے گیت ہونٹوں پہ ہیں منجمد
آج احساس کی رسمِ دیرینہ چھوڑی گئی
آج حسن و صداقت کو کیا ہو گیا
آج نازِ محبّت کو کیا ہو گیا
عارضِ گُل کا رنگِ حنا کیا ہُوا
صرصرِ غم! غرورِ صبا کیا ہُوا
میرے ریحان و سرو و سمن کیا ہُوئے
وہ جمال و وقارِ چمن کیا ہوئے
آج کھیتوں میں نفرت کی فصلیں اُگیں
میرے اپنے درختوں کی شاخیں صلیبیں بنیں

میرے بچوں کو کیسی امانت ملی
خوں میں لتھڑا ہُوا یہ سیہ پیرہن
میری نسلوں کو میری وراثت ملی
میری مٹی کی خوشبو کہاں کھو گئی
میری آنکھوں کے دیپک بجھے کس طرح
میرے آنسو لُٹے ہیں فغاں کھو گئی
آج تابِ مدارات مژگاں نہیں!

۱۹۷۱ء

تُو جانتا ہے

مجھے منظور تھی راحت نہ سکونِ ابدی
مَیں گنہ گار مجھے سوزِ نہاں کافی تھا
میری وارستگیٔ جاں کو
جہانِ گزراں کافی تھا
عشرتِ درد کو سمجھا تھا خزینہ اپنا
مَیں نے سونپا تھا محبت کو سفینہ اپنا
تو نے دیکھا مرے ماتھے پہ لہو کا قشقہ
میری آزردہ ہتھیلی میں لہو کی مہندی

میری مجبور نگاہوں میں لہو کا نوحہ
مری چاہت بھی مرے خوابِ کرم بھی گھائل
حد تو یہ ہے مرے غم بھی گھائل
پسِ زنداں مرے سرو و ریحاں
لالہ و گُل مرے زنجیر بکف دیکھے ہیں
جانے کس ہاتھ نے، تو جانتا ہے
میرے آنگن کے اُجالوں میں لہو گھول دیا
اور مَیں زندہ ہوں
زندگی کے کہیں مجھ سے بھی ہدف دیکھے ہیں؟

۱۹۷۷ء

آج کی رات کتنی تنہا ہے

آج کی رات کتنی تنہا ہے
ہم بھی تنہا ہیں، دل بھی تنہا ہے
قطرہ قطرہ بجھی ہے آنکھوں میں
درد کی آنچ روشنی کی طرح
منجمد تیرگی ہے چار طرف
آج کس در سے مانگنے جائیں
زخمِ احساس، زندگی کی طرح
غم ہی ہوتا تو غم گسار آتے
ہجر کی رات ہم گزار آتے

۱۹۷۲ء

○

دلوں کی راکھ، غبارِ جبیں کی بات کرو
جہاں لُٹے ہیں، اسی سرزمیں کی بات کرو
ہمارے بعد وفاؤں کے دل پہ کیا گزری
محبّتوں کے دمِ آخریں کی بات کرو
شفق سے ڈوبتی کرنوں نے کیا کہا ہو گا
جراحتِ نگہِ واپسیں کی بات کرو
رفیقِ دشتِ تمنّا ابھی خموش نہ ہو
جنوں کا ذکر جنوں آفریں کی بات کرو

کوئی سبیل، کوئی چارہ جی ٹھہرنے کو
جنھوں نے توڑ دیا دل انھیں کی بات کرو

مرے لہو سے کہیں تو کھلے گُل و لالہ
بہ یادِ ہم نفساں آستیں کی بات کرو

صنم کدوں نے نئے بت سجا لیے ہونگے
تم آج اپنی متاعِ جبیں کی بات کرو

مژہ کو قرضِ تمنا ابھی چکانا ہے
کھنڈر کے سائے میں شہرِ حسیں کی بات کرو

صلیبِ شاخ سے سائے کی آرزو تھی ادا
کمالِ سادگیٔ رہ نشیں کی بات کرو

۱۹۷۲ء

کفارہ

دل
جو تم نے توڑ دیا ہے
ان بیلے خوابوں کا کفارہ ہے!

۱۹۷۲ء

١٩٧٣ء

اے شہرِ عزیزاں

اے صبحِ وطن! تیرے اجالوں کی تمنّا
کل بھی مرے رستے ہوئے زخموں کی حنا تھی
کل بھی مری رہبر تھی ترے نام کی خوشبو
اور آج بھی دی ہے تری حرمت پہ گواہی

اے صحنِ چمن! تیری بہاروں کی لگن میں
کس دشتِ بلا خیز سے گزرے ترے رہرو
تشریحِ جنوں کرتے رہے پاؤں کے چھالے
اوراقِ گل و لالہ کی مدھم نہ پڑی لَو

اے صبحِ تمنّا تری راتوں کے مسافر
خونابۂ مژگاں کے سہارے بھی چلے ہیں
کوندی ہیں کبھی درد کی کرنیں سرِ مقتل
پروانوں کی صورت کبھی چپ چاپ جلے ہیں

پہنچے ترے پندار کی چاہت میں کہاں تک
رسوا کبھی سرِ کوچہ و بازار ہُوئے ہیں
دنیا نے سنے حلقۂ زنجیر کے نوحے
تنہائی زنداں کے خریدار ہُوئے ہیں

دیکھے مرے گھائل، مرے حیران غزالاں
صد چاک ہیں دل آج بھی ویران نہیں ہیں
آزردہ و درماندہ و پابندِ سلاسل
پابندِ سلاسل ہیں، پشیمان نہیں ہیں

اے شہرِ عزیزاں! ترے ناموس کی خاطر
ہم جاں سے بھی گزرے تو کوئی بات نہیں ہے
اُبھرے گا اندھیروں سے ترا نیّرِ تاباں
اس رات کے بعد اور کوئی رات نہیں ہے

اے منزلِ ارماں ترے سورج کی ضیا سے
دمکیں ترے قریے، ترے کوچے تری گلیاں
روشن تری عظمت کے سراغ اور زیادہ
اکرام بداماں ترے لمحے تری صدیاں

۱۹۷۳ء

○

وہی ناصبوریٔ آرزو، وہی نقشِ پا، وہی جادہ ہے
کوئی سنگِ رہ کو خبر کرو، اسی آستاں کا ارادہ ہے

وہی اشکِ خوں کے گلاب ہیں، وہی خار خار ہے پیرہن
نہ کرم کی آس بجھی ابھی، نہ ستم کی دھوپ زیادہ ہے

ابھی روشنی کی لکیر سی سرِ رہگزار ہے جاں بلب
کسی دل کی آس مٹی نہیں، کہیں اک دریچہ کشادہ ہے

تنِ زخم زخم کو چھوڑ دے، مرے چارہ گر، مرے مہرباں
دلِ داغ داغ کا حوصلہ تری مرحمت سے زیادہ ہے

جو نظر بچا کے گزر گئے تو نہ آ سکو گے پلٹ کے تم
بڑی محترم ہے یہ بے بسی کہ خلوصِ جاں کا لبادہ ہے

یہی زندگی ہے بُری بھلی، یہ کشیدہ سر، یہ برہنہ پا
نہ غبارِ راہ سے مضمحل، نہ سکونِ جاں کا اعادہ ہے

مرا افتخارِ وفا تلک مجھے راس آ نہ سکا ادا
ترا نام جس پہ لکھا رہا، وہ کتاب آج بھی سادہ ہے

۱۹۷۳ء

○

دل پر جمالِ زخم کا احساں کوئی تو ہے
کچھ بھی سہی، بہارِ بداماں کوئی تو ہے
اک پھول ہے، وہ زینتِ گیسو سہی، مگر
اس انجمن میں چاک گریباں کوئی تو ہے
رونے کا حوصلہ تو کسی آنکھ کو ہُوا
لوگو! وداعِ درد پہ حیراں کوئی تو ہے
کانوں میں گونجتی ہے بڑی آشنا صدا
ویران بستیوں میں غزلخواں کوئی تو ہے

اب تو اداسیاں بھی نہیں دل کے آس پاس
ہم سا نگر میں بے سر و ساماں کوئی تو ہے

جو شاخِ گُل صلیب ہے، دستِ دعا بھی تھی
بے چارگیٔ حسنِ پریشاں کوئی تو ہے

اک آستاں ملا تھا، اُسی آستاں کی خیر
ہے روشنی سی شامِ غریباں کوئی تو ہے

مدّت کے بعد شکر ہے، پلکیں تو نم ہُوئیں
تحفہ برائے نذرِ عزیزاں کوئی تو ہے

اکثر نمازِ دل بھی ادا بے سجود تھی
اس کنجِ عافیت میں بیاباں کوئی تو ہے

ہم نے بھلا کِس سے کہا!

ہم نے بھلا کس سے کہا!
کرتے رہے ہم عُمر بھر
کس رہگزر کی جُستجو
آنکھوں سے کیوں اوجھل ہُوا
منسوب جس کے نام تھی
ہر روشنی، ہر آرزو
سفّاک تھی موجِ بلا
مرگِ تمنّا عام تھی

چپ چاپ ہم کس کے لیے
تھامے رہے جلتے دیے
دیکھو کہ پھر صیقل ہوئے
شہرِ وفا کے آئنے
آتی رُتوں کی آہٹیں
بیتے دنوں کے نقشِ پا
دیکھو کہ وہ آرامِ جاں
ہم پر ہوا پھر مہرباں
ہم نے بھلا کس سے کہا!

۱۹۷۳ء

○

دلوں کی عرضِ تمنّا کو اور کیا کہنا
کبھی کرن، کبھی شبنم، کبھی دعا کہنا

ہزار دشت اس اِک مختصر سی راہ میں ہیں
شمیمِ جاں کو نہ بھولے سے مرحبا کہنا

چلا گیا ہے جو آکر، ہوا کا جھونکا تھا
کبھی سموم اسے کہنا، کبھی صبا کہنا

چلے جہاں سے مسافر وہ گھر کا آنگن تھا
جہاں پہ تھک کے گریں، اُس کو نقشِ پا کہنا

جو زندگی بھی نہیں شرحِ زندگی بھی نہیں
اُسی کو آج بھی کہنا جو آسرا کہنا

نہ جانے کتنے چراغوں کا خوں ہُوا ہو گا
نہیں ہے سہل کسی دل کو بے وفا کہنا

یہ میرے عہد کی، یا خود مری کہانی تھی
جو دسترس سے ہو باہر اُسے خدا کہنا

ہمارے نازِ طلب کا بھی ذکر تو ہو گا
کھنڈر کی اوٹ میں بجھتا ہُوا دیا کہنا

بھنور سے پوچھو اداآب کے ساحلوں کا پتہ
نہ راس آیا سفینے کو ناخدا کہنا

۱۹۷۳ء

○

گلوں کو چھو کے شمیمِ دعا نہیں آئی
کھلا ہوا تھا دریچہ، صبا نہیں آئی

ہوائے دشت! ابھی تو جنوں کا موسم تھا
کہاں تھے ہم، تری آوازِ پا نہیں آئی

ابھی صحیفۂ جاں پر رقم بھی کیا ہو گا
ابھی تو یاد بھی بے ساختہ نہیں آئی

ہم اتنی دور کہاں تھے کہ پھر پلٹ نہ سکیں
سوادِ شہر سے کوئی صدا نہیں آئی

سنا ہے دل بھی نگر تھا، رسا بسا بھی تھا
جلا تو آنچ بھی، اہلِ وفا نہیں آئی

نہ جانے قافلے گزرے کہ ہے قیام ابھی
ابھی چراغ بجھانے ہوا نہیں آئی

بس ایک بار منایا تھا جشنِ محرومی
پھر اُس کے بعد کوئی ابتلا نہیں آئی

ہتھیلیوں کے گلابوں سے خون رستا رہا
مگر وہ شوخیِ رنگِ حنا نہیں آئی

غیورِ دل سے نہ مانگی گئی مراد ادا
برسنے آپ ہی کالی گھٹا نہیں آئی

۱۹۷۳ء

○

جو مہرباں الفاظ تھے کس نے سنے، کس نے کہے
یوں منتظر تیرے لیے، اے نامہ بر، ہم بھی رہے

تلووں کے چھالے کیا کہیں کیوں فاصلے بڑھتے رہے
دشتِ وفا کے مرحلے کس آس پر جی نے سہے

راتوں کے سائے رنج گئے پلکوں کی بھیگی چھاؤں میں
اُجلی رُتوں کی چاہ میں آنکھوں کنول جلتے رہے

بے نام سی اک آرزو، بے تاب سی اِک تشنگی
اپنی کہانی زندگی کس سے کہے، کیسے کہے

○

اندھیرا اتنا بڑھا، کہکشاں اتر آئی
بہل گئی مرے گھر کی اُداس تنہائی

دکھوں کے زرد و سیہ آنسوؤں میں بھیگی رُت
ہمارے پاس چلی آئی، جب بھی گھبرائی

یہ برگِ گُل سی تمنّا، یہ ریگ زار سی دُھوپ
یہ خوش خرام کھلے سر کہاں چلی آئی

وہ رہگزر تھی وفا کی کہ زندگی کا سفر
درخت کا کہیں سایا نہ دھوپ کجلائی

ان جانے گگن کا نام نہ لو

کسی خواب گگن کا نام نہ لو
ان جانے گگن کا نام نہ لو
تم جی کی لگی کو کیا سمجھے
یہاں دھیان وچار بھی روگ بنے
اور جیون بھر کا سوگ بنے
یہ دھرتی اپنی دھرتی ہے
یہاں بیلا چمپا جوہی ہے
تم پھول چنو، خوش کام رہو
بے آس جیو، بے نام رہو

ہم گیانی دھیانی تم سے کہیں
پٹ من نگری کے بند رہیں
یہ من جو بھولا بھالا ہے
ظالم بھیدوں کی دُنیا ہے
اَن بُوجھا ہے اَن جانا ہے

یہاں کون تمھارے سنگ چلے
یہاں کچّی کونپل پاؤں تلے
اس نگری جھاڑ ببول ملیں
برچھی کی اَنی پر پھُول کھلیں

یہاں راگ جلے، یہاں رنگ جلے
کہیں روپ جلے، کہیں انگ جلے
جب آنکھ جلے تو ساکھ جلے
جہاں آگ بجھے وہاں راکھ جلے

اس راکھ کے ڈھیر ملے جیون
پھر روپ نگر درپن درپن
پھر نین کنول درشن درشن
من پنچھی اپنا آپ گگن

۱۹۷۳ء

تم نے ایسا کیوں سوچا تھا

تم نے ایسا کیوں سوچا تھا
خوابوں کی مالا ٹوٹی تو
خالی ہاتھوں لاج آئے گی
گونگی ہو جائیں گی آنکھیں
گیت سے خوشبو کترائے گی
رنگت پھیکی پڑ جائے گی

خوابوں کی مالا ٹوٹی تو
تم نے ایسا کیوں سوچا تھا

آرزوؤں کے راج دو محلے
بن جائیں گے ریت گھروندے

آنگن ریت کا ساگر ہو گا
چاند کی کشتی کیوں اترے گی
شبنم جلووں کو ترسے گی
چاہت دیپک راگ نہ ہو گی
آنسو تک میں آگ نہ ہو گی
آئینہ ویران رہے گا
روپ نگر حیران رہے گا

خوابوں کی مالا ٹوٹی تو
تم نے ایسا کیوں سوچا تھا
تم تو میرے پاس ہو اب تک
موتی میری جھولی میں ہیں

۱۹۷۳ء

○

لَو دے اُٹھے جو اشک تو حُسنِ بیاں کہوں
میں تو بصد خلوص تمھیں مہرباں کہوں

دل بھی اُداس اُداس ہے، غم بھی بجھا بجھا
آیا نہیں جو گھر میں، اُسے میہماں کہوں

عرضِ وفا کو لوحِ مقدّر بھی مان لوں
قتلِ انا کو حادثۂ ناگہاں کہوں

اُمڈی ہوئی گھٹا کو برسنا ضرور تھا
کیوں انتہائے درد کو جی کا زیاں کہوں

انساں تو مراد بھی پتھر سے مانگ لے
میں سنگِ رہگزار کو سنگِ نشاں کہوں

دل بامُراد ہو کے بھی کچھ شادماں نہ تھا
آزارِ جاں کسے، کسے آرامِ جاں کہوں

کچھ آنچ، کچھ چمک سی اَدا ہر نفس میں ہے
اب ہر نفس کو زندگیٔ جاوداں کہوں

۱۹۷۳ء

اندازِ نقشِ پا

یہی تھا احوالِ دل فگاراں
یہی مداراتِ دردِ ہجراں
وہ جب نئی منزلوں چلی تھی
شگفتہ حیرانیاں —— کرن سی
قدم قدم اس کی ہم سفر تھیں
دھنک سے آنچل میں پھول بھی تھے
ہٹیلی راہوں ببول بھی تھے

ہزار جلوے تھے جسم و جاں کے
ہزار آئینے روبرو تھے
کہ دھڑکنیں اُس کی راہبر تھیں
وہی ہے سرشاریٔ تمنّا
وہی ہے اندازِ رہ نورداں
نہ خاک بر سر، نہ چاک داماں
وہی ہے کوئے نگارِ حیرت
حدودِ شہرِ فسوں سلامت
جنوں کی حدِّ کرم نہیں ہے

۱۹۷۲ء

دوسرا قدم

یہ شوخ لال اوڑھنی
جو مامتا کی چھاؤں میں
گلاب سے اُلجھ گئی

نگہ سے پھُوٹتی کرن
لبوں پہ کھیلتی ہنسی
یہ میرے گھر کی چاندنی
مری سحر کی روشنی
جمالِ شہرِ آبرو
غرورِ حرفِ آرزو

یہ پارۂ جگر مرا
فسانۂ دگر مرا
ہے مستجاب ہر دعا
مری نظر، مری نوا
ہر ایک خواب دلربا
امر ہُوا، امر ہُوا

چراغ ہاتھ ہاتھ ہے
تسلسلِ حیات ہے
وہ بامراد ہو گئے
جو مر کے بھی نہ مٹ سکے

۱۹۶۸ء

رخصت

اے میہماں، آہستہ جا
کچھ دیر تجھ کو دیکھ لوں، کچھ دور تیرا ساتھ دوں
جانا تو ہے تجھ کو مگر آرامِ جاں، آہستہ جا
اے میہماں آہستہ جا
دل پر ہیں قدموں کے نشاں مثلِ صبا آہستہ چل
آنکھیں بچھی ہیں راہ میں، دامن کشاں، آہستہ جا
اے میہماں، آہستہ جا!

جھلکے کا مکھڑا پھول سا، گونجیں گی آوازیں تری
دوری کا اندیشہ نہیں، خوابِ رواں آہستہ جا
اے میہماں آہستہ جا!
کرنوں کو یادوں کی طرح راہ سفر آسان ہے
تو مہرِ تابانِ حیاتِ مہرباں، آہستہ جا
اے میہماں، آہستہ جا!
یہ گھر ترا، آنگن ترا، اے نکہتِ آراستہ
اب منتظر تیری نمودِ گلستاں، آہستہ جا!
اے میہماں، آہستہ جا!

اک بار مڑ کر دیکھ لے، آنکھوں میں آنسو تو نہیں
تو منزلوں کی آرزو ہے بے گماں آہستہ جا
اے میہماں، آہستہ جا!

ہمراہ تیرے، رحمتِ ربّ کریم و مہرباں
تجھ پر بہارِ زندگی ہو گُل فشاں آہستہ جا
اے میہماں، آہستہ جا

۱۹۷۳ء

(اپنی بیٹی صبیحہ کے نام)

کہتے ہیں...

کہتے ہیں اب کے بھی فصلِ گُل آئی تھی
نکہت و رنگ نے چھاؤنی چھائی تھی
بے کراں تھا ہر اک لمحۂ مختصر
کامراں تھا نگہ سے نگہ تک سفر
اب کے بھی لوحِ جاں پر ہوئی تھیں رقم
حسن و تقدیس کی جاوداں آیتیں
اب کے بھی عام تھی سلسبیل کرم
زندگی کے محبت کے سب نامہ بر

پلے بہ پلے آئے تھے، صف بہ صف آتے تھے
وہ مزاجِ تمنّا کے رمز آشنا
ماہ و خورشید انجم بکف آتے تھے
ایک مَیں تھی کہ محرومِ نظارہ تھی
میری مجبور آنکھوں کو یہ حکم تھا
تو جہاں بھی رہے، جب یہ نظریں اٹھیں
تیرا چہرہ ہو حدِّ نگاہِ وفا
نکہتوں کا صحیفہ نہیں پڑھ سکی
فرض تھی ناز بردارئ رنگ و بو
فصلِ گُل مجھ سے مایوس واپس گئی!

۱۹۷۳ء

○

آنکھوں میں روپ صبح کی پہلی کرن سا ہے
احوال جی کا، زلفِ شکن در شکن سا ہے
کچھ یادگار اپنی مگر چھوڑ کر گئیں
جاتی رُتوں کا حال دلوں کی لگن سا ہے
آنکھیں برس گئیں تو نکھار اور آگیا
یادوں کا رنگ بھی تو گُل و یاسمن سا ہے
کس موڑ پر ہیں آج ہم اے رہگزارِ ناز
اب درد کا مزاج کسی ہم سخن سا ہے

ہے اب بھی رنگ رنگ تمنّا کا پیرہن
خوابوں کے ساتھ اب بھی وہی حسنِ ظن سا ہے

کن منزلوں لُٹے ہیں محبت کے قافلے
انساں زمیں پہ آج غریب الوطن سا ہے

وہ جس کا ساتھ چھوڑ چکا نازِ آگہی
اب بھی تلاشِ رہ میں وہی راہزن سا ہے

شاخوں کا رنگ روپ خزاں لے گئی مگر
انداز آج بھی وہی اربابِ فن سا ہے

خوشبو کے تھامنے کو بڑھائے ہیں ہاتھ اداؔ
دامانِ آرزو بھی صبا پیرہن سا ہے

۱۹۷۲ء

دیوار

وہ روپ تو پلکوں اوٹ رہا
جس روپ کے ہم دیوانے تھے
تم سپنا بھی، تم چاہت بھی
پر تم کو کہاں پہچانے تھے

جس نگری دیپ سنگھاسن تھا
ان رستوں پہرا ناگوں تھا

جو جیون بھر ہلکان ہوئیں
بیرن بھی وہی دو نیناں تھیں
میں آپ اپنی دیوار بنی
میں نیناں آگے ہار گئی

١٩٧٢ء

○

اندھیرا اتنا بڑھا، کہکشاں اتر آئی
بہل گئی مرے گھر کی اُداس تنہائی

دکھوں کے زرد و سیہ آنسوؤں میں بھیگی رُت
ہمارے پاس چلی آئی، جب بھی گھبرائی

یہ برگِ گُل سی تمنّا، یہ ریگ زار سی دُھوپ
یہ خوش خرام کھلے سر کہاں چلی آئی

وہ رہگزر تھی وفا کی کہ زندگی کا سفر
درخت کا کہیں سایا نہ دھوپ کجلائی

نہ کوئی زخم ہی نکھرا نہ درد ہی چمکا
سنا ہے اب کے برس بھی چلی تھی پُروائی

ہمیں سے ناز اٹھائے گئے اندھیروں کے
ہمیں نے زلفِ شبِ بے قرار سلجھائی

ہم اپنے گھر کی گلی سے قدم بڑھا نہ سکے
ہم اور بامِ حرم سے آشناسائی!

بلاوا

(ممتاز شیریں کی یاد میں)

وہ جو چپ چاپ بھری بزم میں اُٹھ کر چل دیں
یوں دبے پاؤں کہ جیسے کہیں آئیں نہ گئیں
بے نیازی تھی کہ خودداریِ فن تھی لوگو!
شب کی مہماں کوئی گم گشتہ کرن تھی لوگو!
زہر کا جام بھلا راس کسے آیا ہے
درد کا زہر تھا رگ رگ میں لہو کے بدلے
ناتواں دل کے مگر پھر بھی وہی تیور تھے

اور وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی حیراں آنکھیں
نہ ہراساں، نہ پریشاں، نہ پشیماں آنکھیں
وہی آسودہ و مانوس تبسّم لب پر
زہر کا ناز اُٹھایا تو کئی غم بہلے
اتنی تنہائی کہ تنہائی بھی لَو دینے لگے
خامشی ایسی کہ ہنگامۂ محشر جیسے
یاد کے دھندلے دریچوں میں کہیں صف آرا
عہدِ ماضی کے حسیں خواب، تمنّا کے سراغ
دُور افق پار فروزاں کسی فردا کے چراغ

درد کی شب کو اجالوں کے سندیسے بٹتے
چند روز اور امیدوں کے سہارے کٹتے
زندگی کو کئی راہوں سے گزرتے دیکھا
فکرِ انساں کی صداقت کو نہ مرتے دیکھا
موت پہلے بھی تو اُن جیسوں کا مقسوم نہ تھی
جانے کس دیس پہنچنے کی ہوئی تھی جلدی
جانے کس بزم سے آیا تھا بلاوا اب کے!

۱۹۷۳ء

○

خود اپنی ذات سے ہیں شناسائیاں تو ہیں
صحرا میں ہم سفر مری تنہائیاں تو ہیں

پتّھر بھی برگِ گُل ہیں کہ اپنی گلی کے ہیں
آخر بقدرِ ظرف پذیرائیاں تو ہیں

گُل پیرہن ہے آج بھی اندازِ نقشِ پا
یعنی دلوں کی حوصلہ افزائیاں تو ہیں

جھوٹی تسلّیوں کو ترستا رہا ہے جی
کاغذ کے برگ و گُل میں بھی رعنائیاں تو ہیں

اب بھی یہ نام، شکرِ خدا برگزیدہ ہے
لوگو! نگر نگر ابھی رسوائیاں تو ہیں

اب کے بھی فصلِ گُل کی لہو رنگ تھی فضا
مَیں خود جہاں نہیں، مری پرچھائیاں تو ہیں

تم ڈھونڈنے چلی ہو خلوصِ نوا ادا
شہروں میں گونجتی ہوئی شہنائیاں تو ہیں

۱۹۷۳ء

نگاہ اوٹ رہوں، کاشہ خبر میں رہوں
میں بجھتے بجھتے بھی پیراہنِ شرر میں رہوں

مَیں خود ہی روزِ تمنّا، مَیں آپ شامِ فراق
عجب نہیں جو اکیلی بھرے نگر میں رہوں

سلگ اُٹھی تو اندھیروں کا رکھ لیا ہے بھرم
جو روشنی ہوں تو کیوں چشمِ نوحہ گر میں رہوں

تمام عمر سفر میں گزار دوں اپنی
تمام عمر تمنّائے رہگزر میں رہوں

لکھا گیا مجھے آواز خامشی کی طرح
خود اپنا عکس بنوں، سایۂ ہنر میں رہوں

وہ تشنگی تھی کہ شبنم کو ہونٹ ترسے ہیں
وہ آب ہوں کہ مقید گہر گہر میں رہوں

ادا میں نکہتِ گُل بھی نہ تھی، صبا بھی نہ تھی
کہ میہماں سی رہوں اور اپنے گھر میں رہوں

○

اپنا صحرا بھی ساتھ ہی لائی
میری زنجیرِ آبلہ پائی

کس نے برتا ہے رنگِ لالہ و گل
یہ قبا کس بدن کو راس آئی

اتنا تنہا بھی دل نہ تھا پہلے
چاند نکلا تو رات کجلائی

کیوں تمنّا کرن کرن بھٹکے
اب تو لَو دے اٹھی ہے تنہائی

زندگی! ہم تو شرمسار رہے
تو بھی کچھ یاد کر کے پچھتائی

جاگتی آنکھ خواب کیوں دیکھے
اب رہو عمر بھر تماشائی

جتنے چہرے ہیں میرے چہرے ہیں
آئینے آئینے سے آنچ آئی

دل ابھی تک وفا پہ مرتے ہیں
دشت در دشت بزم آرائی

ساتھ آواز تک نہیں ہے ادا
یا خدا! میں کہاں چلی آئی

غزالاں تم تو واقف ہو...

محبت پا بجولاں تھی
وفا صحرا گزیدہ
زندگی پیمانِ گم گشتہ
تمنا مہر بر لب حرفِ خاموشی تہی کیسہ
نہ جانے کون بسمل تھا
نہ جانے کون قاتل تھا
یہاں تو رہزن و رہبر یہی دل تھا

جو مونس تھی

تو بس سفّاک تنہائی

یہی دل تھا یہ ضدّی اَن کہا اَن جان سا رشتہ

رگ گل کا رگِ جاں تک

بگولوں کی ردا اوڑھے ہوئے

اِک دیدۂ بے خواب سے سرِ چراغاں تک

انھیں بے آس ہاتھوں کی

دعائے برگزیدہ سے جمالِ روئے تاباں تک

لہو کے رنگ سے

گلرنگ صحرا تھا

بدن لَو دے اُٹھا تھا
زخم نقشِ پا اُجالا تھا
شبِ ہجراں کی ویرانی کا قرض آخر چکانا تھا
کبھی تو آنے والے کو انھیں رستوں سے آنا تھا